پڑھیے۔ پہلے مصرعے کو اس طرح لکھنا کہ اس کا آخری لفظ دوسرے مصرعے سے ملاکر پڑھنے پر مطلب صاف ہو، یہ مومن کا خاص انداز ہے۔ یہ طریقہ پرانی عربی شاعری سے چلا آرہا ہے۔ پرانی عربی شاعری میں تو کبھی ایک لفظ کے دو حصّے کر دیے جاتے تھے، ایک حصّہ پہلے مصرعے کے آخر میں اور دوسرا حصّہ دوسرے مصرعے کے شروع میں۔ اس طرح کے شعر کو "مُقطّع" کہتے تھے۔

اس غزل کے آخری شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانوں کو ہر چیز ایک مقرّرہ مقدار میں ملتی ہے۔ مثلاً معشوق سے صرف کچھ گھنٹوں کی ملاقات تقدیر میں تھی؛ عاشق افسوس کرتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس سے ملنے جاتا تو یہی چند گھنٹے کئی ملاقاتوں کی شکل اختیار کر لیتے۔

مشق اور مطالعہ

(1) مختلف غزلوں میں سے پانچ شعر ایسے نکالیے، جن میں معاملہ بندی ہو۔

(2) پہلی غزل کے مقطع میں مومن نے عاشق کی کن خصوصیات کا ذکر کیا ہے؟

(3) دوسری غزل کے چوتھے شعر میں معشوق کی تعریف ہے یا اس کے خلاف کوئی بات کہی گئی ہے؟

(4) دوسری غزل کے پانچویں شعر کی نثر بنائیے۔

نواب مرزا خاں داغ

(1831 – 1905)

داغ کی پیدائش دلّی میں ہوئی۔ وہ ابھی نوعمر تھے کہ ان کے والد نواب احمد بخش کا انتقال ہوگیا۔ پھر ان کی والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو سے شادی کرلی۔ اس لیے داغ کی تعلیم و تربیت شاہی قلعے میں ہوئی۔ شاعری میں وہ ذوق کے شاگرد ہوئے۔ فارسی زبان انھوں نے اُس وقت کے ایک مشہور عالم مولوی غیاث الدّین رام پوری سے پڑھی۔ قلعے کے صاحبزادگان کی طرح داغ نے دوسرے علوم اور فنون کے ساتھ شہسواری کی بھی تربیت پائی۔ 1857 کے ہنگامے کے بعد داغ رام پور چلے گئے جہاں وہ نواب کلبِ علی خاں کے دربار میں ملازم رہے۔ 1886 میں نواب کے انتقال کے بعد داغ نے رام پور چھوڑ دیا اور تھوڑے تھوڑے دن کئی شہروں میں رہنے کے بعد 1888 میں حیدر آباد پہنچے۔ نظام حیدر آباد نے ان کو شاعری میں اپنا استاد مقرر کرلیا۔ اس طرح داغ کے آخری سترہ سال بڑے آرام سے گزرے۔ اُن کا انتقال حیدر آباد میں ہوا۔

شاعری میں اُن کی شہرت جو نوجوانی سے شروع ہوئی تھی اس میں

آخر وقت تک کوئی کمی نہ آئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ داغ کے شاگردوں میں اقبال جیسے عظیم الشان شاعر کا نام بھی ہے۔

داغ کی شاعری عام طور پر ہلکے پھلکے عشقیہ جذبات اور معاملات کو بیان کرتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کے اشعار اگر بہت بلند نہیں ہیں تو ایک خاص سطح سے کم تر بھی کبھی نہیں ہوتے۔ ان کی زبان دلّی کی بہترین زبان ہے۔ ان کے اشعار میں روانی اس قدر ہے کہ محسوس ہوتا ہے شاعر نے کسی کوشش یا فکر کے بغیر برجستہ شعر کہہ دیے ہیں۔

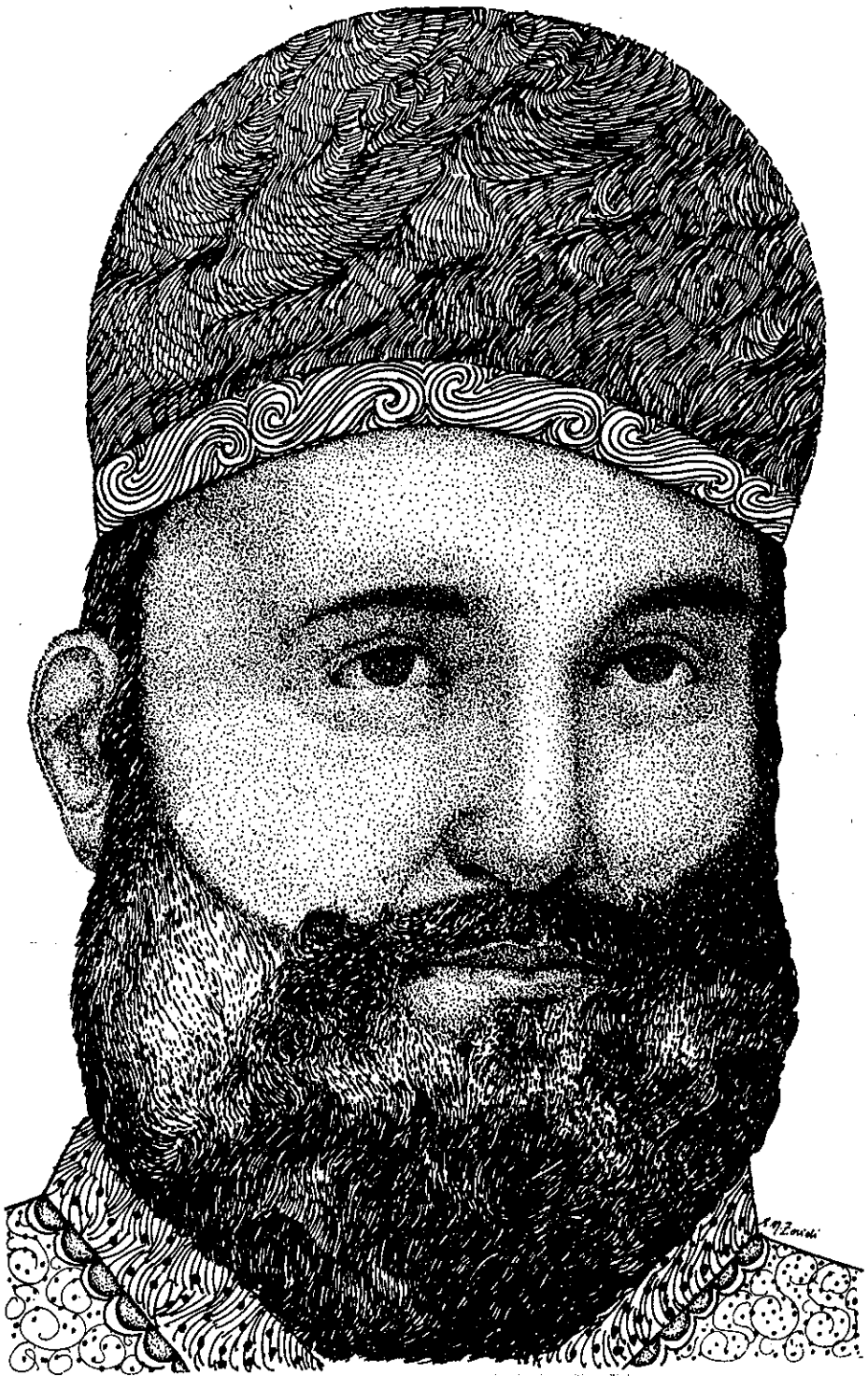

①

اس جفا کا جبھی مزا مِلتا
کوئی تجھ کو اگر بُرا مِلتا
مدّعی بن کے دل بغل میں رہا
کاش یہ دشمنوں سے جا مِلتا
تیرے کوچے میں چھوڑ آئے تھے
زندہ رہتا جو دل تو آ مِلتا
دوستوں سے تو کچھ نہ نکلا کام
کوئی دشمن ہی کام کا مِلتا
روز اک دل لگی نئی ہوتی
روز اک دل مجھے نیا مِلتا

②

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
افشائے رازِ عشق میں گو ذلّتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا جان تو گیا
ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

معنی اور اشارے

مدّعی = مخالف
جتا دینا = ظاہر کر دینا، ثابت کر دینا
جان گیا = واقف ہو گیا

غور کرنے کی بات

غزل نمبر ایک، شعر نمبر دو: "مدّعی" بمعنی "دشمن" اب بہت کم بولتے ہیں۔ "مدّعی" کے یہ معنی فارسی کے محاورے "دعویٰ کردن" (بمعنی "جھگڑا کرنا") سے نکلے ہیں۔

شعر نمبر چار: "دشمن" کو معشوق کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح شعر میں ایک نیا حُسن پیدا ہو گیا ہے۔

غزل نمبر دو، شعر نمبر ایک: اس شعر میں کنائے کی خوبی ہے۔ اگرچہ یہ بات ظاہر نہیں کی ہے کہ جھوٹی قسم کس نے کھائی ہے اور کس بارے میں کھائی ہے، لیکن الفاظ کا قرینہ ایسا ہے کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ معشوق نے قسم کھا کر کہا ہے کہ ہم نے آپ کا دل نہیں لیا، یا ہم سچّا وعدہ کر رہے ہیں۔ شعر میں بول چال کا لہجہ بھی خوب ہے۔

شعر نمبر دو: اس شعر میں بھی گفتگو کا لہجہ بہت برجستہ اور دل کش ہے۔

شعر نمبر چار: یہ شعر بجا طور پر بہت مشہور ہے۔ پہلے زمانے میں اکثر یہ طریقہ تھا کہ سامان کو کسی سُست رفتار گاڑی کے ذریعے آگے بھیج دیتے تھے اور

اس کے بعد خود کسی تیز سواری کے ذریعے کوچ کرتے تھے۔ عام زندگی کے اس تجربے کو جینے اور مرنے کے مضمون پر بڑی خوبی سے برتا گیا ہے۔ ہوش، حواس، طاقت اور برداشت کو انسان کی زندگی کا سامان کہنا بھی بہت عمدہ ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ داغ کا یہ شعر دراصل میر کے مندرجہ ذیل قطعے سے ماخوذ ہے۔ یا کم سے کم اتنا ضرور ہے کہ میر اس مضمون کو پہلے ہی بیان کر چکے تھے۔ میر کا قطعہ ہے :

کیا فہم کیا فراست ذوق و بصر سماعت — تاب و توان و طاقت یہ کر گئے سفر سب
منزل کو مرگ کی تھا آخر مجھے پہنچنا — بھیجا ہے میں نے اپنا اسباب پیشتر سب

(دیوان سوم)

غزل نمبر دو کے مقطع میں لفظ "تواں"، فارسی مصدر "توانستن" نکلا ہے۔ لفظ "تواں" کا تلفظ "فُغاں" کی طرح کیجیے یعنی "تُ آں"۔

مشق اور مطالعہ

(1) غزل نمبر ایک، شعر نمبر چار : اس شعر کا مقابلہ غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے کیجیے :

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

(2) "دل لے کے مفت" سے کیا مراد ہے ؟

(3) میرؔ کا جو قطعہ اوپر لکھا گیا اس کے معنی بیان کیجیے۔

مثنوی

مثنوی کی تاریخ، غزل سے کچھ ہی کم پرانی ہے۔ غزل کی طرح مثنوی کو بھی ایران میں فروغ ہوا چنانچہ ایرانی شاعری کا پہلا بڑا کارنامہ یعنی "شاہ نامۂ فردوسی" مثنوی ہی ہے۔

جیسا کہ اس کے نام سے اندازہ ہو سکتا ہے، مثنوی دو دو ہم قافیہ مصرعوں کے اشعار سے بنی ہوئی ایک نظم ہوتی ہے۔ مثنوی میں بھی اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے لیکن عام طور پر مثنوی لمبی نظم ہی کو کہتے ہیں۔ مثنوی میں زیادہ تر عشق و عاشقی یا جنگ اور مہم جوئی کی داستانیں بیان ہوتی تھیں لیکن یہ صورتِ حال جلد ہی بدل گئی اور مثنوی کو صوفیانہ و فلسفیانہ موضوعات کے لیے بھی آزادی سے استعمال کیا جانے لگا۔

مثنوی میں کوئی قصّہ بیان کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی شرط یہ ہوتی ہے کہ قصّے کے پورے اجزا موجود ہوں اور منظر نگاری اور کردار نگاری اس طرح کی ہو کہ سب باتیں کھُل کر سامنے آجائیں۔ اردو میں مثنوی شاید غزل سے کچھ پہلے ہی شروع ہو گئی ہو لیکن جب اُردو شاعری میں غزل کا رنگ چمکا تو اس سے مثنوی کو کوئی نقصان نہ ہوا۔ اردو کے قدیم شاعروں مثلاً

نُصرتی، ابنِ نشاطی اور وجہی نے بہت اچھی مثنویاں لکھی ہیں اور اسی زمانے میں غزل میں بھی کئی اہم شاعر نمایاں ہوئے ہیں۔

اب سے کوئی سو برس پہلے تک یہ رسم تھی کہ شاعر کو اپنا کمال ظاہر کرنے کے لیے غزل، قصیدہ اور مثنوی تینوں ہی میں اظہارِ خیال کرنا پڑتا تھا۔ تہذیب کے رسم و رواج میں تبدیلی نے قصیدے کو تقریباً ختم کردیا۔ ساتھ ہی مثنوی بھی اپنی مقبولیت کھو بیٹھی۔ قصیدے کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن مثنوی کا اپنے درجے سے گر جانا ہماری ادبی تاریخ کا ایسا سانحہ ہے، جس کی وجہ ابھی پوری طرح بیان نہیں ہوسکی ہے۔

جدید شعرا نے کچھ لمبی نظمیں لکھی ہیں اور کہا گیا ہے کہ لمبی نظموں نے مثنوی کی جگہ لے لی ہے، لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ لمبی نظمیں بہت کم شاعروں نے لکھی ہیں۔ اقبال نے اردو میں بہت سی نظمیں ایسی لکھی ہیں جن میں سو سے اوپر شعر ہیں لیکن ان میں صرف ایک مثنوی ہے "ساقی نامہ"۔ لیکن ان ہی اقبال نے اسی زمانے میں فارسی میں لمبی لمبی تین مثنویاں لکھیں۔

اردو میں مثنوی کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جدید زمانہ کم فرصتی کا زمانہ ہے اور اختصار کو پسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ اسی زمانے میں ناول بھی لکھا جارہا ہے، تھوڑی بہت لمبی نظمیں بھی لکھی جارہی ہیں اور اِکّا دُکّا مثنوی بھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے ہماری کچھ چیزیں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ناپسندیدہ قرار پائیں، ان میں مثنوی اور داستان بھی

شامل ہیں۔ اردو کی زیادہ تر مثنویوں میں داستانی رنگ غالب ہے لہٰذا ممکن ہے کہ جب داستان کی مقبولیت کم ہوئی تو مثنوی کی بھی مقبولیت گھٹ گئی۔ وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن مثنوی کے زوال نے ہمیں ایک ایسی صِنف سے محروم کردیا جو قصّہ بیان کرنے سے لے کر فلسفیانہ مسائل پر بحث تک ہر طرح کے اسلوب کے لیے مناسب تھی۔

مثنوی عام طور پر چھوٹی بحر میں لکھی جاتی ہے چونکہ زیادہ تر مثنویاں سات چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں اس لیے بعض لوگوں نے یہ فرض کرلیا کہ یہی بحریں مثنوی کے لیے مخصوص ہیں۔ مثنوی کے زیادہ تر اشعار غیر مردّف ہوتے ہیں، ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ غیر مردّف مصرعے والے اشعار کو بیانیہ انداز میں بہ آوازِ بلند پڑھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔